''لاجونتی'' کا ایک اور تجزیہ

ڈاکٹر ظہیر عباس*

Abstract:

Rajendar Singh Bedi is most renowned short story writer in Urdu. Though quantity of his stories is less than many of other Urdu short story writers but the worth of his work is greater than all others. "Lajwanti" is most famous and highly appreciated short story of Rajndar Singh Bedi. Many of Urdu critics has discussed or analyzed it. In this article some new aspects of this short story are brought in to the light which were unseen before.

تخلیقی ادب میں بے شمار ایسے کردار تخلیق ہو چکے جن کی شہرت ان کے تخلیق کاروں سے زیادہ ہے۔ ہومر کے اکلیز اور ہیکٹر سے شروع ہو جائیں، موجودہ عہد تک آتے آتے ایسے شاہکار سے ہمارا سامنا ہوتا ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اویدیپس، الیکٹرا، میکبتھ، ہیملٹ، کنگ لیئر، ڈان کیخوٹے، مادام بواری، اینا کارینینا، کراموزوف برادران، پرنس مشکن، مائیکل کوہلس، امراؤ جان ادا وغیرہ کتنے ہی ایسے کردار ہیں۔ ان سے جب جب ہمارا سامنا ہوتا ہے یہ ہر ہر بار ایک نئے روپ میں ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ بعض تخلیقی فن پاروں میں مرکزی کردار ہی پورے فن پارے پر حاوی ہوتا ہے لیکن بعض جگہ ثانوی کردار اس آئینے کا کردار ادا کرتا ہے جس کے بغیر مرکزی کردار خود اپنی پہچان سے قاصر ہوتا ہے۔ ایسے فن پاروں میں ثانوی کردار اس دیے کی طرح ہوتا ہے جو مرکزی کردار کو راستہ سجھاتا ہے۔ لوک کہانیوں کے وزیر، شہزادوں کے دوست، شہزادیوں کی سہیلیاں، سانچو پانزہ اگر ڈان کیخوتے کے ساتھ نہ ہوتا تو کیخوتے وہ بن ہی نہیں سکتا تھا جو اس طاقتور ثانوی کردار کے ذریعے بن جاتا ہے۔ اسی طرح Jacques the Fatalist and His Master میں Jacques کے کردار کی قوت اس کا استاد ہے۔ عالمی

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج، راوی روڈ شاہدرہ، لاہور۔

ادب میں ایسی بے شمار مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں جہاں مرکزی کردار ثانوی کردار کا مرہون منت ہے۔ ثانوی کردار آئینے کے اس عکس کی طرح ہوتا ہے جس کے بغیر حقیقی چہرے کا بناؤ سنگھار ممکن نہیں ہوتا۔

اگر ہم اردو ناول پر نظر دوڑائیں تو ہمیں ایسے کردار تو نظر نہیں آتے جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اس طرح کے مرکزی اور ثانوی کردار ناول میں پیدا کرنے کے لیے ابھی اردو کو بہت سفر طے کرنا ہے۔ البتہ اردو افسانے میں ایسے کردار ہمیں جا بجا نظر آ جاتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم جس ثانوی کردار پر بات کریں گے وہ بیدی کے مشہور افسانے ''لاجونتی'' کا کردار سندر لال ہے جو لاجونتی کا شوہر ہے۔ یہی وہ کردار ہے جو لاجونتی کو صحیح معنوں میں لاجونتی بناتا ہے۔ جس طرح ٹھنڈا گوشت کا موضوع جنس نہیں ہے لیکن ایک ذہنی مریض اس سے بھی لذت کشید کر سکتا ہے۔۔ اسی طرح ''لاجونتی'' کا موضوع بھی فسادنہیں ہے لیکن ایک عام قاری خونریزی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ بڑے فنکار کا کمال یہی ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق ہر سطح کے قاری کو متاثر کرتی ہے۔ یہاں افسانہ نگار میاں بیوی کے درمیان بدلتے رشتے کی تصویر کشی غیر معمولی خارجی حالات کے بغیر نہیں کر سکتا تھا سو اس نے فسادات کو بطور خام مواد کے اپنے افسانے میں برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے میں مردوں کی شخصیت پر بحث کرتی عورتیں ہمیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ شوہروں کی مار پیٹ کا ذکر بھی مزے لے لے کر کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ شوہر کی حیثیت ان کے مالک کی ہے جو پیار محبت بھی کرتا ہے اور ضرورت پڑنے ان پر ہاتھ بھی اٹھا سکتا ہے اور یہ اس کا حق ہے۔ یہ بیدی کا ایسا افسانہ ہے جس پر تعریفی اور تنقیصی ہر دو حوالوں سے بہت لکھا گیا۔

افسانہ عورت کی حساسیت اور مرد کی اندرونی کشمکش کا مظہر ہے۔ انسان کی اندرونی توڑ پھوڑ میں خارج کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ افسانے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے خارج میں فسادات کی تخلیق لازم تھی اور یہ کام بیدی نے بخوبی سرانجام دیا ہے۔

اغوا سے پہلے سندر لال کا لاجونتی سے کوئی اتنا اچھا سلوک نہیں تھا۔ وہ اسے جانوروں کی طرح مارتا پیٹتا تھا لیکن وہ اس مار پیٹ کا برا نہیں مناتی تھی کیونکہ وہاں ایک مکمل مرد ہی اس مار پیٹ کا حق رکھتا تھا۔ یہ بات وہاں کی عورتیں نجی محفلوں میں مزے لے لے کر کرتیں۔ بیویوں کو مار پیٹ صحت مند تعلق کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس مار پیٹ کی لذت سے آشنا عورتیں ہی ہیں جو مرد کی تعریف یوں کرتی ہیں ''لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا؟ دو ہاتھ کی عورت قابو میں نہیں آتی''(۱)۔ سو یہ ہے وہ ماحول جس میں لاجو شادی سے پہلے زندگی بسر کر رہی ہے۔ شوہر اگر مارتا ہے تو پیار بھی بہت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندر لال کے ایک بار مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہیں روک پاتی۔ وارث علوی نے اپنے تجزیے میں ''گرہن'' کے مرکزی کردار رسیلا کی مار پیٹ کا سندر لال کی مار پیٹ سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''گرہن میں رسیلا ہولی کے گال پر ایک طمانچہ مارتا ہے۔ جو اپنی انگلیوں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ یہ طمانچہ رسیلے کی بدکرداری کا نقش قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ لاجونتی میں بیدی نے سندرلال کی مار پیٹ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کوئی منظر نہیں دکھایا۔ اگر دکھاتے تو تشدد اور کرودھ کا ایسا ہی کوئی نظارہ سامنے آتا۔''(۲)

انہوں نے کتنی آسانی سے سندرلال کو رسیلا کے ساتھ لا کھڑا کیا ہے حالانکہ دونوں کرداروں کی نفسیات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ رسیلا ایک بدکردار اور ظالم انسان ہے۔ اس کے اس ظلم اور کرودھ کے پیچھے اس کے خاندان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ کوئی اس کے ہاتھ کو روکنے والا نہیں ہے بلکہ اسے باقاعدہ تشدد پر اکسایا جاتا ہے۔ گال پر تھپڑ اسے مارا جاتا ہے جس کی عزت نفس مجروع کرنا مقصود ہو اور ''گرہن'' کی ہولی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ وہ پیٹ سے ہے لیکن کسی کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے نکلتی ہے تو دریا کنارے اس شخص کے ہتھے چڑھ جاتی ہے جس پر اسے اعتبار ہے۔ پورا افسانہ وحشت اور خوف کی فضاء میں لپٹا ہوا ہے۔ رسیلا ایک بدتہذیب اور وحشی انسان ہے جس کے سدھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ گرہن میں تشدد کی اگر یہ پیشکش نہ ہوتی تو افسانہ شاہکار بن ہی نہیں سکتا تھا۔ لاجونتی میں تشدد مصنف کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ یہاں مار پیٹ میں وہ کرودھ نہیں ہے جو گرہن کا خاصہ ہے۔ سندرلال اسے عادتاً مارتا ہے لیکن پھر وہ مان بھی جاتا ہے۔ گرہن میں ہولی دو مردوں کے ہتھے چڑھتی ہے۔ وہ دونوں نفسیاتی مریض اور وحشی ہیں۔ ان کے نزدیک عورت صرف مرد کی ہوس بجھانے والا کردار ہے۔ لاجونتی میں بھی دو ہی مرد ہیں۔ ایک وہ جس کے پاس سے وہ ہو کر آتی ہے اور دوسرا اس کا شوہر۔ یہ دونوں مرد ظالم اور سفاک نہیں ہیں۔ جس کے پاس وہ اغوا کے زمانے میں رہتی ہے اسے اس کا پورا احساس ہے لیکن ظاہر ہے وہ اس کا اپنا مرد نہیں ہے اس لیے اجنبیت کی وجہ سے وہ اس سے خوفزدہ رہتی ہے۔ اس افسانے میں مرد کی شخصیت کا جو روپ دکھانا مقصود تھا بیدی نے وہی دکھایا ہے۔ افسانے کے مرد محبت کرنے والے ہیں۔ اس معاملے میں وہ عورت کو سمجھ پائے یا نہیں وہ علیحدہ سوال ہے لیکن ان کے لیے عورت ایک زندہ نامیہ ضرور ہے محض وہ جنسی ہوس بجھانے والا آلہ نہیں ہے۔ سندرلال کو وارث علوی ٹھیک طرح سمجھ ہی نہیں پائے۔ مثلاً جب سندرلال اپنے دوست کی شادی پر پہلی بار لاجو کو دیکھتا ہے تو دولہا کے کان میں یہ کہہ کر اس کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھتا ہے۔ ''تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار، تیری بیوی بھی چٹ پٹی ہوگی۔''(۳) وارث علوی کا کہنا ہے کہ یہ بات اس کے ''رنگین مزاج اور عورت کا شوقین''(۴) ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اب یہ کتنی سامنے کی اور سادہ سی بات ہے کسی شادی پہ ایک لڑکا جاتا ہے اور اپنے لیے بھی ایک لڑکی پسند کر آتا ہے۔ اس میں رنگین مزاجی والی کون سی بات ہوئی؟ کسی کنوارے لڑکے کا یوں اپنے لیے کسی لڑکی کو پسند کرنا تو ایک صحت مند انسانی رویہ ہے۔ ہاں اگر کوئی شادی شدہ مرد اس طرح کے جذبات رکھتا ہو تو

ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ رنگین مزاج ہے۔ پورے افسانے میں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ سندرلال کے عورتوں کا شوقین ہے۔ سندرلال محبت کی شادی کرتا ہے اور آخر تک نباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

رسیلا کے مقابلے میں سندرلال ایک ایسا مرد ہے جو معاشرے میں عورت کے لیے ایسی پناہ گاہ کی مانند ہے جس کے ہوتے ہوئے اسے کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔ مرد بھگوان ہے تو کبھی خدا ہے۔ اس کا ہر عمل عورت کی بہتری کے لیے ہے۔ یہ وہ عورت ہے جو کسی اور روپ میں خاوند کی چتا کے ساتھ بخوشی جل جانے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اس عورت کا تعلق اس روایت کے ساتھ ہے کہ بیوگی کی حالت میں بھی اسی کی ہو کر رہنا ہے۔ یہاں مار پیٹ کی کیا حیثیت ہے۔ کسی کی محبت میں اپنی مرضی سے جان سے گزر جانا شعروادب میں قابل تحسین وقابل رشک عمل رہا ہے۔ مسئلہ تو اس وقت پیدا ہوا جب اخلاقیات کے نام نہاد علمبرداروں نے دوسروں کے ذاتی معاملات میں مداخلت کو اپنا حق تسلیم کرنا شروع کیا۔ جب عورت کو اس کی مرضی کے خلاف ستی کرنا شروع کیا۔ جب اس کی جنسی زندگی کا گلہ گھونٹ کر اسے دوسری شادی سے محروم رکھا جانے لگا۔ جب اس کے والدین سے یہ حق چھین لیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کی قسمت کا فیصلہ کرسکیں۔

افسانے کا آغاز ہی اس کشمکش سے ہوتا ہے۔ بٹوارے کے بعد ادھر کی عورتیں ادھر اور ادھر کی ادھر منتقل کردی گئی ہیں۔ اس گاؤں کے لوگ اس نئی روایت کا آغاز کرتے ہیں۔ وہاں کے چند سر پھرے مردان عورتوں کے حق میں اس پروگرام کا آغاز کرتے ہیں کہ وہ عورتیں جو اپنی مرضی کے خلاف اغوا ہوگئی ہیں۔ ان کے دل زخمی ہیں اگر وہ تبادلے کے سلسلے میں دوبارہ اپنے مردوں کے پاس آتی ہیں تو انہیں بخوشی قبول کریں۔ انہیں دھتکار کر ان کے زخمی دلوں کو اور تارتار مت کریں۔ اس پروگرام کا سلوگن ''دل میں بساؤ'' ہے۔ یہ روایت دراصل نئی نہیں ہے بلکہ صدیوں پرانی روایت کا احیا ہے۔ جب مرد وزن اپنی مرضی سے گزران کرتے تھے۔ ان کی حیا تیاتی زندگی میں کسی کا دخل نہیں تھا۔ جونہی لوگوں نے اپنی مرضی سے گھر بساؤ سلوگن کے تحت اپنی تحریک کا آغاز کیا مندر کی طرف سے مخالفت کی صدائیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔ وہ مندر جو انسانوں کے نجی ترین معاملات پر بن پوچھے رائے دینا اور رائے ٹھونسنا اپنا حق سمجھتا ہے یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ معاشرے کی اچھوت مخلوق کو دل جیسی پاکیزہ دنیا میں جگہ دی جائے۔ سو اس عمل کی بھرپور مخالف شروع ہوجاتی ہے۔ سو''نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے اس کی بڑی مخالفت ہوتی ہے''۔(۵) مزے داری کی بات یہ ہے کہ سوائے مذہبی طبقے کے اس پروگرام کی کوئی اور مخالفت نہیں کرتا۔

اس طبقے کی مخالفت کے باوجود وہ لٹی ہوئی عورتوں کے بارے میں رائے عامہ تبدیل کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔ اس پروگرام کا روح رواں ایک ایسا شخص ہے جس کی اپنی چہیتی بیوی لاجو بھی غدر میں اغوا ہو چکی

ہے۔ پنجابی ہندوستان کا روایتی مرد اپنی بیوی کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو دوسرے مرد کرتے چلے آئے ہیں یعنی مار پیٹ۔ اب جبکہ وہ غوا ہوچکی ہے، خبر نہیں کہ وہ کہاں ہے زندہ بھی ہے یا نہیں؟ اگر زندہ ہے بھی تو کس حالت میں ہے۔ بازاروں میں ''ہتھ لایاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے'' گاتے ہوئے، ہمہ وقت اس کے دماغ میں یہی خیالات گردش کرتے رہتے ہیں۔ لاجو جب اس کے پاس تھی تو ''اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ جگہ اٹھنے بیٹھنے، کھانے کی طرف سے بے توجہی برتنے اور ایسی ہی اور معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔''(٦) جواباً وہ دھان پان سی لڑکی اس کی ایک مسکراہٹ پر ساری مار پیٹ بھول جاتی تھی۔ سندرلال لاجو کے کھو جانے کے بعد اسی پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ وہ اپنے رویے اور لاجو کے صبر پر خود کو ایک مجرم تصور کرتا ہے۔ اپنی اس تکلیف کا مداوا وہ ''دل میں بساؤ پروگرام'' کا سیکرٹری بن کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا وہ کسی اخلاقیاتی کتاب، کسی مذہبی صحیفے یا کسی مذہبی شخصیت کی مدد سے نہیں کرتا اور نہ اس کا مقصد نیکی کمانا اور آخرت کی زندگی سنوارنا ہے۔ یہ دراصل انسانی وجود میں موجود وہ صلے سے بے نیاز خیر کی توانائی ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے۔ خیر کی یہ صورت ہمیشہ سے ان طاقتوں کو ناقابل قبول رہی ہے جن کے گمان میں انسانی تقدیر کی ڈور ان کے ہاتھ میں ہے۔

پورے افسانے میں ان دو گروہوں کے درمیان تصادم کی صورت رہتی ہے۔ مذہبی رہنماؤں کے نزدیک پوترتا کا تعلق صرف مرد کے ساتھ ہے۔ عورت اگر غیر کے گھر سے ہو آئے چاہے اس کی مرضی اس میں شامل ہو یا نہ وہ اپنے باپ، بھائی اور شوہر کے لیے ناقابل قبول ہے۔ گاؤں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو ان مذہبی پیشواؤں کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ دراصل وہ لوگ ہیں جن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ان لوگوں نے سلب کرلی ہے۔ ان کے نزدیک انسانی رشتوں سے زیادہ وہ آدرش عزیز ہیں جن کی پاسداری کرتے ہوئے انسان صدیوں سے اپنوں کا خون بہاتا آیا ہے۔ وہ آدرش ہی کیا جس کی بنیاد میں ہزاروں لاکھوں معصوموں کا خون نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب کچھ مغوی لٹی پٹی وہاں آتی ہیں ان کے اپنے انہیں پہچاننے سے انکار کردیتے ہیں۔

> ''مغوی عورتیں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں، جن کے ماں باپ، بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کردیا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کی خاطر انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو زندگی سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان لے لی۔ لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں اور کس پتھرائی نگاہوں سے وہ موت کو گھور رہی ہیں، اس دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی

میں اپنا نام دہراتی ہے: سہاگ ونتی۔ سہاگ والی! اور اپنے بھائی کو اس جمِ غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی ہے: ''تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری! میں نے تجھے گودی میں کھلایا تھا رے!'' اور بہاری چل دینا چاہتا ہے۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کر نارائن بابا کی طرف دیکھتے ہیں اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا ہے جو در اصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔'' (۷)

اس ایک پیرا گراف میں بیدی نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس ایک پیرا گراف میں انسانوں کے کئی روپ ہیں جو انہوں نے دکھا دیے ہیں۔ انسان کی کھوکھلی غیرت، المنا کی، سفاکیت اور بے بسی۔ انسانی رویوں کے کتنے رنگ ہیں یہاں۔ عصمت اور غیرت کی جتنی بھی گردانیں ہیں وہ انہی کی رٹی رٹائی ہیں جن کے نزدیک زندہ اور صحت مند رشتوں کی کوئی قدر نہیں۔ شوہر، بھائی، ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو قبولنا چاہتے ہیں لیکن بے بس ہیں۔ بہاری کو جب اس کی بڑی بہن اپنے پیار کا واسطہ دے کر بلاتی ہے تو بے بس بھائی بھی تڑپ اٹھتا ہے لیکن اس کے احساسات پر نارائن بابا جیسے لوگوں نے کائی کی دبیز تہہ چڑھا دی ہے۔ وہ بے بسی کے عالم میں ماں باپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے۔ بہن آنکھوں کے سامنے ہے۔ پتہ نہیں کتنی مصیبتوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہے۔ بات بھی اس کی ٹھیک ہے۔ بچپن میں کتنا کھلاتی اور پیار کرتی تھی ناں! سارا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا ہے۔ وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا ہے جو بت بنے کھڑے ہیں۔ ان کے لیے اپنے بچوں سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں۔ وہ آخری بار اس امید سے نارائن بابا کی طرف دیکھتے ہیں کہ شاید وہ اپنا کہا جھٹلا دیں اور کہہ دیں کہ جاؤ اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لو۔ عصمت، غیرت، عزت کی گردانیں سب جھوٹ ہے۔ عورت بھی مرد کی طرح ہی ایک مخلوق ہے۔ ایک زندہ نامیہ ہے۔ ہاں بس کمزور ہے۔ یہ کب اپنی مرضی سے گئی تھیں۔ یہ واپس آنا چاہتی تھیں اسی لیے آئیں۔ اگر وہاں خوش ہوتیں تو کب آتیں؟ جاؤ اپنی، بیٹیوں، بہنوں، بیویوں کو گلے سے لگا کو، انہیں دلوں میں جگہ دو۔ لیکن یہاں یہ معجزہ رونما نہیں ہوتا۔ نارائن بابا بے بسی سے آسمان کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے اس ساری صورت حال کا ذمہ دار وہ ہی ہے۔ ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں جو کچھ غیب سے احکامات ملتے ہیں ہم ان پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ لیکن جس حقیقت کا سامنا کرنے سے نارائن بابا جیسے لوگ انکاری ہیں وہ یہ ہے کہ آسمان کی کوئی حیثیت نہیں۔ سارا کچھ انسانوں ہی کا کیا دھرا ہے۔ انسان ہی انسان کا دشمن ہے۔ کسی انسان کے ساتھ اس سے بڑی دشمنی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے عزیز ترین رشتوں کو بھی نظریے کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ نارائن بابا سفاکیت سے آسمان کی طرف دیکھتا رہتا ہے اور وہ لٹی پٹی عورتیں واپس ادھر جہاں سے وہ جان چھڑا کر آئی تھیں اور ماں باپ، بہن بھائی اور شوہر خود کا سہارا دینے کے لیے مذہبی اشلوک گنگناتے اپنے اپنے گھروں کو۔ خود کو یہ تسلی دیتے

ہوئے کہ آخر نارائن بابا نے ہم سے اتنی بڑی قربانی لی ہے کوئی تو اس میں بھی حکمت ہوگی۔

نارائن بابا اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ جو ان کے پیروکار ہیں انہیں اپنے چنگل میں پھنسائے رکھنے کے لیے ایسے اجتماعات کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ وہاں وہ قدیم شاستروں، اشلوکوں اور رامائن وغیرہ سے حوالے دے دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسی عورتوں کو گھروں میں دوبارہ بسانے کے لیے رام چندر جی ہونا پڑتا ہے اور تو اور انہوں نے بھی سیتا کو گھر سے نکال دیا تھا۔ سو ایسی عورت جو کسی غیر مرد کے پاس رہ آئے اگر بعد میں وہ دیوی کے درجے پر بھی فائز ہو جائے تو بھی ناقابل قبول ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا علیحدہ سے کوئی وجود نہیں۔ یہ مرد ہی ہے جس کی وجہ سے اس کی عزت اور ذلت ہے۔ لگاتار ایسے اجتماعات منعقد کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ گاؤں کے قدامت پرستوں کا سندرلال، رسالو اور نیکی رام جیسے لوگ جو ایسی ناپاک عورتوں کے حق میں جلسے جلوس کرتے پھر رہے ہیں کہیں وہ ان معصوم لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ قدامت پرستوں کی ان ''دل میں بساؤ'' کے ساتھ مڈبھیڑ بھی ہوتی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو بات ہاتھاپائی تک بھی آن پہنچتی ہے۔ ایسا تب ہوتا ہے جب ایک روز وہ پرچار کرنے کے لیے قدامت پرستوں کے علاقے میں جا نکلتے ہیں اور اتفاقاً نارائن بابا عورت اور مرد کے تعلق کی کتھا رامائن سے ہی سنا رہے ہوتے ہیں ''جہاں ایک دھوبی نے دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا اور اس سے کہہ دیا تھا: ''میں راجہ رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ کر آنے پر بھی سیتا کو بسالے گا''(۸)

اب جن بھولے بھالے لوگوں کو بڑی ذمہ داری سے یہ افیون دی جائے گی وہ نشے سے باہر کب نکل سکتے ہیں۔ جب سندرلال نارائن بابا کی اس بات پر احتجاج کرتا ہے تو ان کے چیلے اسے مارنے کو دوڑتے ہیں۔ بڑی مشکل سے بچ بچاؤ ہوتا ہے۔ سندرلال کے مشکل سوالوں کے جواب میں جب نارائن بابا سے بات نہیں بن پڑتی تو وہ میٹھی زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ''ہم شاستروں کی مان مریادا کو نہیں سمجھتے سندرلال!''(۹) جواب میں سندرلال جو نہیں کہتا ہے وہ اپنی اندرونی کایا کلپ کے بعد اس کا نظریہ حیات ہے اس کی زندگی کی فلاسفی ہے۔ وہ جب بھگوان رام پر براہ راست چوٹ کرتا ہے تو دراصل وہ اس خاص آدرشی سوچ پر چوٹ کرتا ہے جس میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ مرد ہی ہے جو سب کچھ ہے چاہے وہ مرد رام چندر جی ہی کیوں نہ ہوں۔

> ''اس سنسار میں بہت سی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کرسکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا، اور آج بھی

بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی تھی۔
اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک چھل
اور ایک کپٹ کا شکار نہیں تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور ایستھ کی بات ہے یا راکشش
راون کے وحشی پن کی بات ہے؟''(۱۰)

افسانے میں یہی وہ مقام ہے جہاں نارائن بابا کی تمام محنت اکارت چلی جاتی ہے۔اغوا کے بعد سے لے کر اب تک انہوں نے لوگوں کو اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی۔سندر لال اس کا پول کھول دیتا ہے۔قدامت پرستانہ سوچ کو بری طرح شکست ہوتی ہے۔اس واقعے کے بعد اور بھی بہت سے لوگ ''دل میں بساؤ'' پروگرام میں شامل ہو جاتے ہیں۔نئے لوگوں میں سے بیشتر وہی ہیں جنھیں سندر لال کا وجود کسی طرح بھی برداشت نہیں تھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان بسا اوقات جب اپنے مسائل کا حل قدیم دانش میں نہیں پاتا تو اسے شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن اس کے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ وہ اسے چیلنج کر سکے۔ایسے میں جب کوئی سر پھرا بغاوت کا اعلان کرتا ہے تو شروع میں لوگ ڈرتے، جھجکتے چوری چھپے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔پھر مناسب وقت آنے پر وہ ڈنکے کی چوٹ پر اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔یہاں بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔

یہ تو تھا افسانے میں سندر لال کی شخصیت کا معاشرتی پہلو۔نجی سطح پر اس کی شخصیت بہت توڑ پھوڑ کا شکار ہے۔سندر لال کی شخصیت میں اتنی بڑی تبدیلی کا سبب اس کا وہ رویہ ہے جو غدر سے پہلے وہ لاجو سے روا رکھتا ہے۔اک پچھتاوے کی آگ ہے جس میں جل رہا ہے۔اس کے چلے جانے کے بعد وہ ایک بے یقینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔اسے امید نہیں ہے کہ لاجو کبھی واپس بھی آئے گی۔یہ بے یقینی کی کیفیت ہی ہے جس کی وجہ سے بات بات پر اس کے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ظاہری بات ہے اس کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی غدر کی وجہ سے آئی ہے۔یہ وہی تبدیلی ہے جو ایشر سنگھ میں بھی آتی ہے۔تقسیم کے واقعے کو بطور خام مواد کے برتتے ہوئے منٹو اور بیدی دونوں نے چند بہترین کہانیاں تخلیق کی ہیں۔انسان معاشرے میں جو چہرہ لیے پھرتا ہے وہ عام طور پر اس کا اصل چہرہ نہیں ہوتا۔یہ تو اچانک آپڑنے والی آفتیں ہیں جن کی وجہ سے اس کا اصلی چہرہ نمودار ہوتا ہے۔''کھول دو'' میں اپنی ہی ہم وطن کی عصمت دری کرنے والے بھی وہی لوگ تھے جو اس عمل کے لیے کسی ایسے ہی موقعے کی تلاش میں تھے۔حادثہ انسانی کی شخصیت کے منفی اور مثبت دونوں طرح کے امکانات کو ابھار کر ہمارے سامنے لے آتا ہے۔انسانی وجود میں پنہاں خیر اور شر کی قوتوں کا کسی خاص مسلک یا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔یہ بات کسی فنکار سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔''ٹھنڈا گوشت'' میں ایشر سنگھ مسلمان نہیں ہے اور نہ ہی کھول دو کے درندے کافر ہیں۔خود سندر لال کا شادی سے پہلے کا رویہ کوئی اتنا متاثر کن نہیں ہے۔یہ تقسیم اور لاجو کا اغوا ہے جو مل کر اس کی شخصیت کو

بالکل ہی الٹ دیتے ہیں۔

افسانے کی ظاہری قرات میں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ سندر لال میں آنے والی تبدیلی مثبت ہے۔لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔اگر ہم پنجابی گیت کے اس بول پر غور کریں جو وہ پورے افسانے میں گنگناتے پھرتے ہیں تو کافی حد تک ان کے آدرش کو سمجھ سکتے ہیں۔''ہتھ لایاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے''۔نعرے لگانے والے لاجونتی کے بوٹے کی ماہیت سے واقف نہیں ہیں۔یہ بوٹا ہاتھ لگانے سے لجا جاتا ہے بالکل ویسے ہی جیسے محبت سے ہاتھ لگائیں تو لڑکی شرما جاتی ہے۔سکڑ جاتی ہے۔اس پودے کو واپس پہلی حالت میں آنے کے لیے کچھ وقت لگتا ہے۔اتنا ہی وقت جتنا کسی دوشیزہ کو سانسیں بحال کرنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔نسائی مزاج رکھنے والا یہ پودا اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے باقی تمام پودوں سے مختلف ہے۔سندھی زبان میں لاجونتی کو شرم بوٹی بھی کہتے ہیں۔سندر لال کے گمان میں عورت کو ہاتھ لگانے کا مطلب ہے اسے مار پیٹ کرنا،جیسی کہ وہ تقسیم سے پہلے کرتا تھا۔وہ اسی بات کا پرچار کرتا ہے کہ وہ عورتیں جو اغوا ہوگئیں اگر وہ کسی طرح واپس آجائیں تو ان کے ساتھ ایسا مثالی سلوک کیا جائے کہ وہ ماضی کے واقعات کو بالکل ہی فراموش کر دیں۔ان کے دل پہلے ہی زخمی ہیں اگر ہم انہیں اشاروں کنایوں میں بھی وہ باتیں یاد کرائیں گے تو وہ لاجونتی کے پودے کی طرح کمھلا جائیں گی۔جس بات کو وہ اور اس کے ساتھی سمجھنے سے قاصر ہیں وہ یہ ہے کہ جس کے ساتھ حادثہ ہو جائے،جو تکلیف میں مبتلا ہو اگر اس سے اس کے دل کی بات نہ پوچھی جائے تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔عورت کو محبت سے چھونے کا مطلب ہے اس کے ساتھ زندہ اور نامیاتی رشتہ استوار کرنا۔لاجو جب واپس آتی ہے تو جس سندر لال سے اس کا سامنا ہوتا ہے وہ اب ایک رشی بن چکا ہے۔عام انسان نہیں رہا جبکہ لاجو اب بھی وہی ہے جو تقسیم سے پہلے تھی۔ایک رشی یا ولی صفت انسان کے نزدیک رشتوں کا وہ تصور نا پید ہو جاتا ہے جس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں،روٹھنا منانا،لڑنا جھگڑنا۔غرضیکہ وہ اپنے آدرشوں کی وجہ سے عام انسانوں سے تھوڑا اوپر اٹھ جاتا ہے۔اس کے نزدیک خود تکلیف میں رہ کر ہی دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔سندر لال کے نزدیک سچا رام راج وہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔یہ ہے وہ سندر لال جو اب ایک شوہر کی بجائے اوتار بن چکا ہے۔اس کے نزدیک لاجو ایک دیوی ہے۔دیویوں کی پوجا کی جاتی ہے انہیں ہاتھ نہیں لگایا جاتا۔دوسری طرف لاجو اور بھی زیادہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔دل کا غبار نہ نکلنے کی وجہ سے وہ روز بروز گھٹن کا شکار ہو رہی ہے۔جب وہ اسے بتاتی ہے کہ جس مسلمان کے گھر میں وہ رہی تھی وہ اسے بالکل نہیں مارتا تھا لیکن مجھے پھر بھی اس سے خوف آتا تھا۔تم مارتے بھی تھے لیکن تم سے ڈر نہیں لگتا تھا۔لاجو پہلے والی لاجو بننا چاہتی ہے لیکن اب سندر لال وہ نہیں رہا۔سندر لال اب سماج سیوک بن چکا ہے۔اپنے گھر کے اندر سلگتی آگ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔اس کی بیوی مرد وزن کے نامیاتی رشتے کو ڈھونڈتی ہے پر اب کچھ نہیں بچا۔

''وہ بس گئی پر اجڑ گئی۔ سندرلال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں
اور نہ آہیں سننے کے لیے کان۔ محلّہ ملاشکور کا سب سے بڑا اسدھارک خود بھی نہ جان
سکا کہ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ پر بھات پھیریاں نکلتی رہیں اور رسالو اور نیکی
رام کے ساتھ مل کر ایک میکانکی آواز میں گا تا رہا:
''ہتھ لایاں کملان نی لاجونتی دے بوٹے''(۱۱)

وہ جس نے عورتوں کو بسانے کے لیے زمانے بھر سے ٹکر لی وہ خود ایک چکر کاٹ کر اسی مقام پر کھڑا ہے لیکن اسے اس کا ادراک نہیں ہے۔ قدیم سوچ والوں نے ان عورتوں کو قبولنے سے انکار کیا تو انہوں نے اس نامیاتی رشتے کو پامال کر دیا۔ انہوں نے عورتوں کو پاؤں کی نوک پر رکھا تو انہوں نے اسے اس کی مرضی کے خلاف ایسی دیوی کے استھان پر بٹھا کر اسے ایک ابدی تنہائی کا شکار کر دیا۔ وہ جو پلٹا دی گئیں وہ بھی دکھ میں رہیں، جو کبھی واپس نہیں آئیں وہ بھی برے حالوں میں رہی ہوں گی اور جنھیں اپنوں نے قبول کر لیا ان کے حصے میں جو عذاب آیا وہ سب سے شدید تھا۔ سندرلال بیوی کی محبت میں ولی صفت انسان تو بن جاتا ہے لیکن اچھا شوہر نہیں بن پاتا اور یہی اس افسانے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ راجندر سنگھ بیدی، مجموعہ ''راجندر سنگھ بیدی''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۵۹۳
۲۔ وارث علوی، ''راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶، ص ۲۳۹
۳۔ راجندر سنگھ بیدی، مجموعہ ''راجندر سنگھ بیدی''، ص ۵۹۳
۴۔ وارث علوی، ''راجندر سنگھ بیدی ایک مطالعہ''، ص ۲۴۰
۵۔ راجندر سنگھ بیدی، مجموعہ ''راجندر سنگھ بیدی''، ص ۵۹۱
۶۔ ایضاً، ص ۵۹۲
۷۔ ایضاً، ص ۵۹۵
۸۔ ایضاً، ص ۵۹۵
۹۔ ایضاً، ص ۵۹۶
۱۰۔ ایضاً، ص ۵۹۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۶۰۴